ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 418

Program: B.A. / Associate Degree

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: اخلاقیات(418) • سطح: بی اے / ایسوسی ایٹ ڈگری

سمسٹر: خزاں2026

امتحانی مشق نمبر 1

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر(بی اے): 40 • کامیابی کے نمبر(اے ڈی): 50 • کریڈٹ: 3

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

(مطالعہ وحوالہ کے لیے)

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹ پڑھیں، مفاہیم کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر جوابات اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنا مناسب نہیں۔

سوال نمبر1: اخلاقیات کے لیے معیارات(20نمبر)

سوال نمبر1۔ اخلاقیات کے لیے معیارات کیا ہیں؟ تفصیل سے تحریر کریں۔(20)

تعارف

انسان جب بھی کسی عمل کو اچھا یا برا، درست یا غلط، پسندیدہ یا ناپسندیدہ کہتا ہے تو وہ دراصل کسی نہ کسی معیار کو سامنے رکھ کر فیصلہ کر رہا ہوتا ہے۔ اگر کوئی معیار ہی موجود نہ ہو تو اچھائی اور برائی کے الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں، کیونکہ پھر ہر شخص اپنی خواہش کو ہی اچھائی قرار دے گا اور معاشرے میں اخلاقی انارکی پھیل جائے گی۔ اسی لیے علمِ اخلاق کا سب سے بنیادی سوال یہی ہے کہ وہ کون سے معیارات ہیں جن کی روشنی میں کسی عمل، کسی عادت اور کسی کردار کی اخلاقی قدر متعین کی جا سکے۔ معیار سے مراد وہ اصول، وہ کسوٹی اور وہ پیمانہ ہے جس پر پرکھ کر ہم کسی فعل کو خیر یا شر کہتے ہیں۔

مختلف زمانوں اور مختلف تہذیبوں میں ان معیارات کے بارے میں اختلاف پایا گیا ہے۔ کہیں خوشی اور لذت کو معیار بنایا گیا، کہیں عقل کو، کہیں معاشرتی رسم و رواج کو اور کہیں مذہبی احکام کو۔ اسلام نے اس مسئلے میں ایک جامع اور متوازن موقف پیش کیا ہے جس میں وحی کو بنیادی ماخذ مانا گیا ہے، مگر عقل، فطرت اور انسانی فلاح کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اس جواب میں ہم اخلاقیات کے لیے مقرر کیے گئے اہم معیارات کو تفصیل سے بیان کریں گے اور آخر میں ان کا تقابلی جائزہ پیش کریں گے۔

معیار سے مراد اور اس کی ضرورت

معیار کا لفظی مطلب ہے کسوٹی، یعنی وہ پتھر جس پر سونے کو رگڑ کر اس کی خالصیت پرکھی جاتی ہے۔ اخلاقی اصطلاح میں معیار وہ اصول ہے جس کی بنیاد پر افعال کی اخلاقی قدر و قیمت کا تعین ہوتا ہے۔ جس طرح لمبائی ناپنے کے لیے میٹر اور وزن کے لیے کلو گرام کا پیمانہ مقرر ہے، اسی طرح کردار کو جانچنے کے لیے بھی ایک مقررہ پیمانہ ناگزیر ہے، ورنہ ہر قوم، ہر طبقہ بلکہ ہر فرد اپنے مزاج کے مطابق اچھائی اور برائی کی الگ تعریف گھڑ لے گا۔

معیار کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ انسانی زندگی میں پیش آنے والے بے شمار مسائل میں فیصلہ کرنا آسان ہو جائے۔ جب ایک نوجوان کے سامنے سچ اور جھوٹ، امانت اور خیانت، خدمت اور خود غرضی میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب آتا ہے تو وہ اسی معیار کی طرف رجوع کرتا ہے جو اس کے عقیدے اور اس کی تربیت نے اسے دیا ہوتا ہے۔ مستقل اور غیر متبدل معیار انسان کو ذہنی انتشار سے بچاتا ہے اور معاشرے کو ایک مشترک اخلاقی زبان فراہم کرتا ہے۔

پہلا معیار: وحی اور مذہبی احکام

اسلامی نقطۂ نظر سے اخلاقیات کا سب سے اعلیٰ اور مستند معیار وحیِ الٰہی ہے، یعنی قرآنِ مجید اور سنتِ رسول ﷺ۔ اس معیار کے مطابق جو عمل اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق ہو وہ خیر ہے اور جو اس کے خلاف ہو وہ شر ہے۔ اس معیار کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا اٹل اور غیر متبدل ہونا ہے۔ انسانی عقل زمانے، جگہ اور حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، مگر وحی کا دیا ہوا اصول ہر دور اور ہر معاشرے کے لیے یکساں رہتا ہے۔ سچ بولنا کل بھی فضیلت تھا، آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

اس معیار کی دوسری خصوصیت اس کا آفاقی اور ہمہ گیر ہونا ہے۔ وحی صرف عبادات ہی نہیں بلکہ معاملات، معاشرت، معیشت اور سیاست سمیت زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی دیتی ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ساتھ جزا و سزا کا ایک مکمل نظام وابستہ ہے، یعنی آخرت کی جوابدہی کا احساس انسان کو اس وقت بھی برائی سے روکتا ہے جب کوئی دیکھنے والا موجود نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی اخلاقیات میں نیت کو بھی عمل کے ساتھ شامل کیا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ دلوں کے حال سے واقف ہے۔

دوسرا معیار: عقل

بہت سے مفکرین نے عقل کو اخلاق کا معیار قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کو اچھائی اور برائی میں تمیز کی صلاحیت فطری طور پر عطا کی گئی ہے اور وہ اپنی عقل سے جان سکتا ہے کہ کون سا عمل درست ہے۔ مغربی فلسفی کانٹ نے عقل کو خاص اہمیت دی اور کہا کہ اخلاقی قانون وہی ہے جسے عقل ہر انسان کے لیے یکساں طور پر لازم قرار دے۔ اس معیار کی خوبی یہ ہے کہ یہ انسان کو اندھی تقلید سے نکال کر شعوری فیصلے کی طرف لے جاتا ہے اور اسے اپنے عمل کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔

تاہم عقل کو واحد اور آخری معیار ماننے میں کئی کمزوریاں ہیں۔ عقل ہر انسان کی یکساں نہیں ہوتی، تعلیم، ماحول اور ذاتی مفادات اس پر اثر انداز ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ایک ہی مسئلے پر عقلمند لوگ بھی اختلاف کرتے ہیں۔ پھر عقل زیادہ تر ذرائع کا فیصلہ کرتی ہے، مقاصد کے تعین میں وہ اکثر مذہب اور وحی کی محتاج رہتی ہے۔ اسلام عقل کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے، اسے وحی کی روشنی میں استعمال کرنے کی دعوت دیتا ہے، مگر اسے وحی سے بالاتر مستقل معیار نہیں مانتا۔

تیسرا معیار: فطرت اور ضمیر

ایک معیار انسانی فطرت اور ضمیر کی آواز کو بھی قرار دیا گیا ہے۔ ہر انسان کے اندر ایک داخلی عدالت موجود ہے جو اچھے عمل پر سکون اور برے عمل پر بے چینی اور ملامت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ بچہ بھی جھوٹ بول کر شرمندگی محسوس کرتا ہے اور کسی کی مدد کر کے خوشی پاتا ہے۔ یہ احساس اس بات کا ثبوت ہے کہ خیر و شر کی پہچان انسان کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ قرآنِ مجید نے بھی انسانی نفس کو الہامِ فجور و تقویٰ کا حامل قرار دیا ہے، یعنی انسان کو برائی اور پرہیز گاری دونوں کی پہچان عطا کی گئی ہے۔

ضمیر ایک قیمتی معیار ضرور ہے، مگر اسے تنہا کافی نہیں سمجھا جا سکتا۔ مسلسل گناہ اور بے حسی ضمیر کو مردہ کر دیتی ہے، اور بعض لوگ غلط کام کر کے بھی مطمئن رہتے ہیں کیونکہ ان کی تربیت ہی ایسی ہوئی ہے۔ اسی طرح مختلف ثقافتوں میں پروان چڑھنے والے افراد کے ضمیر کی آواز بھی مختلف ہو سکتی ہے۔ اس لیے ضمیر کو وحی اور صحیح تربیت کی رہنمائی درکار رہتی ہے تاکہ وہ درست سمت میں فیصلہ دے سکے۔

چوتھا معیار: انسانی فلاح، نفع اور خوشی

ایک بڑا مکتبِ فکر اخلاق کا معیار انسانی فلاح اور اجتماعی نفع کو قرار دیتا ہے۔ اس نظریے کے حامی، جنہیں افادیت پسند کہا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ جو عمل زیادہ سے زیادہ انسانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ خوشی اور فائدہ پیدا کرے وہی اچھا ہے۔ اس معیار کی کشش یہ ہے کہ یہ اخلاق کو عملی زندگی سے جوڑتا ہے اور نتائج کی بنیاد پر فیصلہ کرتا ہے۔ صدقہ، خدمتِ خلق، تعلیم کی اشاعت اور امن کا قیام اسی معیار پر پورا اترتے ہیں کیونکہ ان کے فوائد پورے معاشرے تک پہنچتے ہیں۔

لیکن محض نفع اور خوشی کو معیار بنانے سے سنگین مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اگر اکثریت کی خوشی ہی معیار ہو تو اقلیت کے حقوق پامال ہو سکتے ہیں، اور وقتی لذت کو دائمی فلاح پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ اسلام نے انسانی فلاح کو بلاشبہ مقصود قرار دیا ہے، مگر اسے وحی کی حدود کے اندر رکھا ہے، یعنی جو نفع اللہ کی رضا اور عدل کے اصولوں کے خلاف ہو وہ حقیقی فلاح نہیں بلکہ وقتی فریب ہے۔

پانچواں معیار: رسم ورواج اور معاشرتی اقدار

عملی زندگی میں بہت سے لوگ اپنے معاشرے کے رسم ورواج اور رائج اقدار کو ہی اخلاق کا معیار سمجھتے ہیں۔ جو کچھ خاندان، برادری اور معاشرہ پسند کرے وہ اچھا اور جسے وہ برا سمجھے وہ برا۔ اس معیار کا ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ معاشرتی ہم آہنگی پیدا کرتا ہے اور انسان کو اپنے ماحول سے جوڑ کر رکھتا ہے۔ مہمان نوازی، بڑوں کا احترام اور پڑوسیوں کے حقوق جیسی اقدار بہت سے معاشروں میں رسم ورواج ہی کے ذریعے محفوظ رہتی ہیں۔

مگر رسم ورواج کو حتمی معیار ماننا درست نہیں، کیونکہ معاشروں میں جاہلانہ رسمیں بھی رائج ہو جاتی ہیں۔ کبھی دختر کشی، کبھی ذات پات کی تفریق اور کبھی فضول خرچی کو عزت کا معیار سمجھا گیا۔ اگر رسم ہی کسوٹی ہوتی تو اصلاح کی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی۔ اسلام نے اچھی رسموں کو برقرار رکھا اور بری رسموں کو ختم کیا، یعنی رسم ورواج کو بھی وحی کے معیار پر پرکھا گیا، اسے خود معیار نہیں بنایا گیا۔

اسلامی معیار کی جامعیت

مندرجہ بالا بحث سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے کسی ایک جزوی معیار کو لے کر باقی سب کو رد نہیں کیا بلکہ ایک جامع ترتیب قائم کی ہے۔ اس ترتیب میں سب سے اوپر وحی ہے جو اصول اور حدود متعین کرتی ہے۔ اس کے بعد عقل ہے جو ان اصولوں کو سمجھتی اور جزئیات پر منطبق کرتی ہے۔ پھر فطرت و ضمیر ہے جو داخلی محرک کا کام دیتا ہے، اور انسانی فلاح وہ مقصد ہے جس کی تکمیل کے لیے یہ سارا نظام قائم ہے۔ یوں اسلامی معیار نہ خشک مذہبی جمود ہے اور نہ بے لگام انسانی خواہش، بلکہ ایک متوازن وحدت ہے۔

اس جامعیت کا عملی ثبوت یہ ہے کہ اسلام کے اخلاقی احکام چودہ سو سال گزرنے کے باوجود آج بھی قابلِ عمل اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ سچائی، امانت، عدل، رحم، عفو اور ایفائے عہد کو آج بھی دنیا بھر میں فضیلت مانا جاتا ہے، جبکہ محض طاقت اور مفاد پر مبنی معیارات بار بار بدلتے اور انسانیت کو جنگ و فساد کی طرف لے جاتے رہے ہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اخلاقیات کے لیے معیارات سے مراد وہ کسوٹیاں ہیں جن پر افعال اور کردار کو پرکھا جاتا ہے۔ اہم معیارات میں وحی و مذہبی احکام، عقل، فطرت و ضمیر، انسانی فلاح و نفع اور رسم و رواج شامل ہیں۔ ان میں سے ہر معیار میں کچھ نہ کچھ صداقت موجود ہے، مگر تنہا کوئی بھی معیار کامل نہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سب سے جامع ہے کیونکہ وہ وحی کو بنیاد بناتا ہے، عقل کو رہنما کا معاون، ضمیر کو داخلی نگران اور انسانی فلاح کو مقصد قرار دیتا ہے۔ طالبِ علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اسی ترتیب کو اپنائے تاکہ اس کے فیصلے وقتی جذبے کے بجائے مستقل اصولوں پر مبنی ہوں۔

سوال نمبر 2: اخلاق کی حقیقت اور ماہیت (20 نمبر)

سوال نمبر 2۔ اخلاق کی حقیقت اور ماہیت بیان کریں۔ (20)

تعارف

اخلاق انسانی زندگی کا وہ جوہر ہے جو انسان کو دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے۔ کھانا، پینا اور نسل بڑھانا تو حیوانات بھی کرتے ہیں، مگر اچھائی اور برائی کا شعور، دوسروں کے حقوق کا احترام اور اپنے رویے کی ذمہ داری صرف انسان ہی کو حاصل ہے۔ اسی لیے جب ہم کسی شخص کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ بااخلاق ہے یا بداخلاق، تو ہم اس کی پوری شخصیت کے بارے میں ایک فیصلہ صادر کر رہے ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اخلاق کہتے کسے ہیں، اس کی حقیقت کیا ہے اور اس کی ماہیت، یعنی اس کا اصل مزاج اور دائرہ کار کیا ہے؟

اس سوال کا جواب اس لیے بھی ضروری ہے کہ عام طور پر اخلاق کو محض خوش اخلاقی، نرمی سے بات کرنے یا مسکرا کر ملنے تک محدود سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ اخلاق اس سے کہیں وسیع حقیقت کا نام ہے۔ اخلاق کا تعلق انسان کے باطن سے بھی ہے، ظاہر سے بھی، اس کے خالق سے بھی اور مخلوق سے بھی۔ اس جواب میں ہم اخلاق کی لغوی و اصطلاحی تعریف، اس کی حقیقت کے مختلف پہلو اور اس کی ماہیت کو تفصیل سے بیان کریں گے۔

اخلاق کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

اخلاق عربی زبان کے لفظ خُلُق کی جمع ہے جس کے معنی ہیں عادت، طبیعت، سیرت اور فطرت۔ عربی میں خَلق کا لفظ ظاہری صورت کے لیے اور خُلق کا لفظ باطنی صورت کے لیے استعمال ہوتا ہے، یعنی جس طرح انسان کا چہرہ اس کی ظاہری شناخت ہے اسی طرح اس کے اخلاق اس کی باطنی شناخت ہیں۔ جس انسان کی باطنی صورت خوبصورت ہو وہی حقیقت میں حسین ہے، خواہ اس کی ظاہری شکل وصورت عام سی ہو۔ کیوں؟

اصطلاح میں اہلِ علم نے اخلاق کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ امام غزالیؒ کے نزدیک اخلاق نفس کی اس پختہ کیفیت کا نام ہے جس سے افعال بغیر سوچے سمجھے غور و فکر کی محتاجی کے، آسانی اور سہولت سے سرزد ہوں۔ اگر اس کیفیت سے اچھے افعال صادر ہوں تو اسے حسنِ اخلاق اور اگر برے افعال صادر ہوں تو اسے سوءِ اخلاق کہتے ہیں۔ اس تعریف سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں: اول یہ کہ اخلاق کا تعلق نفس کی اندرونی کیفیت سے ہے، دوم یہ کہ وہ کیفیت پختہ اور مستقل ہو، اور سوم یہ کہ عمل سوچ سمجھ کر تکلف سے نہیں بلکہ طبیعت کی روانی سے صادر ہو۔

اخلاق کی حقیقت: باطنی کیفیت کا خارجی اظہار

اخلاق کی اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ انسان کے باطن کی کیفیت ہے جس کا اظہار اس کے ظاہری افعال سے ہوتا ہے۔ جس طرح درخت کی جڑیں زمین کے اندر چھپی ہوتی ہیں اور اس کے پھل شاخوں پر نظر آتے ہیں، اسی طرح اخلاق کی جڑیں انسان کے دل، اس کے عقیدے اور اس کی سوچ میں ہوتی ہیں اور اس کے پھل اس کے رویے، گفتگو اور معاملات میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے محض چند دن اچھا رویہ اختیار کر لینا اخلاق نہیں کہلاتا جب تک وہ رویہ انسان کی مستقل طبیعت نہ بن جائے۔

یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھار سچ بولنے والا سچا نہیں کہلاتا بلکہ وہی سچا کہلاتا ہے جو ہر حال میں سچ پر قائم رہے، یہاں تک کہ سچ بولنا اس کے لیے سب سے آسان کام بن جائے۔ اسی طرح ایک آدھ مرتبہ کسی کی مدد کر دینے سے کوئی سخی نہیں بن جاتا، سخاوت اس وقت صفت بنتی ہے جب خرچ کرنا طبیعت میں سما جائے۔ امام غزالیؒ نے اسی لیے چار ارکان گنائے ہیں جن کے مجموعے سے اخلاق وجود میں آتا ہے: فعل کا حسن، اس پر قدرت، اس کا علم اور نفس کی وہ پختہ حالت جو فعل کو آسانی سے صادر کرے۔

اخلاق تکلف اور بناوٹ سے مختلف ہے

اخلاق کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اسے تکلف اور بناوٹ سے الگ کرنا ضروری ہے۔ بعض لوگ محفل میں بڑی نرمی اور شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر گھر والوں اور ماتحتوں کے ساتھ بدزبانی کرتے ہیں۔ بعض لوگ نام و نمود کے لیے صدقہ کرتے ہیں اور بعض ذاتی مفاد کے لیے امانت داری دکھاتے ہیں۔ یہ رویے دیکھنے میں اخلاقی معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت میں اخلاق نہیں، کیونکہ ان کے پیچھے نفس کی پاکیزہ کیفیت کے بجائے شہرت، خوف یا لالچ کارفرما ہے۔

حقیقی اخلاق کی پہچان یہ ہے کہ وہ تنہائی اور محفل، امیری اور غریبی، طاقت اور کمزوری ہر حال میں یکساں رہے۔ جو شخص اس وقت بھی کسی کو دھوکا نہیں دیتا جب دھوکا دینا آسان اور محفوظ ہو، وہی امانت دار ہے۔ اسی معیار کی وجہ سے اخلاق کی تربیت میں نیت کی اصلاح کو بنیادی مقام دیا گیا ہے، کیونکہ نیت ہی وہ اندرونی محرک ہے جو عمل کو بناوٹ سے نکال کر حقیقی اخلاق بناتا ہے۔

اخلاق کی ماہیت: دائرہ اور وسعت

ماہیت سے مراد کسی چیز کی اصل نوعیت اور اس کا جامع تصور ہے۔ اخلاق کی ماہیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے کسی ایک شعبے تک محدود نہیں بلکہ پورے انسانی وجود پر محیط ہے۔ اس کا پہلا دائرہ انسان کا اپنے خالق سے تعلق ہے، جس میں اخلاص، شکر، توکل، خوف و امید اور عبادت کی پابندی شامل ہے۔ دوسرا دائرہ انسان کا اپنے نفس سے تعلق ہے، جس میں خودداری، صبر، قناعت، ضبطِ نفس اور تزکیہ شامل ہے۔ تیسرا دائرہ انسان کا دوسرے انسانوں سے تعلق ہے، جسے حقوق العباد کہا جاتا ہے۔

اخلاق کی ماہیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ یہ محض انفرادی خوبی نہیں بلکہ ایک ایسی قوت ہے جو پورے سماجی نظام کو چلاتی ہے۔ جب ہم اخلاق کی تعریف کو وسیع کر کے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قانون، تجارت، سیاست اور بین الاقوامی تعلقات تک سب اسی کے دائرے میں آتے ہیں۔ ملاوٹ سے پرہیز تجارتی اخلاق ہے، وعدے کی پاسداری سیاسی اخلاق ہے اور کمزور کی حفاظت سماجی اخلاق ہے۔ اس لیے اخلاق کو نرم گفتاری تک محدود کرنا اس کی ماہیت کو تنگ کر دینا ہے۔

اخلاق عقیدے اور عبادت سے جڑا ہوا ہے

اسلامی تصور میں اخلاق کی ایک منفرد خصوصیت یہ ہے کہ یہ عقیدے اور عبادت سے الگ کوئی آزاد شعبہ نہیں بلکہ انہی کی عملی صورت ہے۔ نماز کی بابت فرمایا گیا کہ وہ بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے، روزہ تقویٰ پیدا کرنے کے لیے فرض کیا گیا، زکاۃ مال کی محبت کم کر کے ہمدردی سکھاتی ہے اور حج صبر، مساوات اور ضبطِ نفس کی تربیت ہے۔ اگر عبادت اخلاق میں بہتری نہ لائے تو سمجھنا چاہیے کہ اس کی روح نکال دی گئی ہے اور صرف رسم باقی رہ گئی ہے۔

اسی طرح ایمان اور اخلاق کا تعلق بھی گہرا ہے۔ احادیث میں سچائی کو ایمان کی علامت اور جھوٹ کو نفاق کی نشانی قرار دیا گیا ہے، اور کامل ایمان والا اسے کہا گیا جو اخلاق میں سب سے بہتر ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی اخلاق کی ماہیت دینی ہے، یعنی اس کی جڑ اسلام سے ملتی ہے اور اس کی شاخیں زمین پر پھلتی ہیں۔ یہی تعلق اخلاق کو وہ استحکام عطا کرتا ہے جو محض معاشرتی دباؤ یا قانونی خوف سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

اخلاق فطری بھی ہے اور کسبی بھی

اخلاق کی ماہیت کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ یہ فطری اور کسبی دونوں ہے۔ فطری اس لحاظ سے کہ ہر انسان نیکی کی طرف میلان اور برائی سے نفرت کی صلاحیت لے کر پیدا ہوتا ہے، اور کسبی اس لحاظ سے کہ یہ صلاحیتیں محنت، تربیت اور مسلسل مشق سے پروان چڑھتی یا ماند پڑ جاتی ہیں۔ کچھ لوگ طبیعتاً نرم مزاج اور کچھ سخت مزاج ہوتے ہیں، مگر یہ فرق کسی کو اخلاقی ذمہ داری سے آزاد نہیں کرتا، کیونکہ انسان کو اپنی طبیعت کو سدھارنے کی قدرت دی گئی ہے۔

تاریخ اور روزمرہ مشاہدہ اس کی تصدیق کرتا ہے کہ بڑے بڑے بدطبع لوگ بھی صحبت، تعلیم اور خود احتسابی سے بدل جاتے ہیں، اور نیک لوگ غفلت سے بگڑ جاتے ہیں۔ اگر اخلاق صرف پیدائشی ہوتا تو وعظ، تعلیم اور تربیت سب بے کار ہوتے اور جزا و سزا کا تصور بھی ختم ہو جاتا۔ اس لیے درست موقف یہ ہے کہ فطرت بیج فراہم کرتی ہے اور کسب اس بیج کو درخت بناتا ہے۔

اخلاق اور قانون میں فرق

اخلاق کی ماہیت کو قانون سے اس کے فرق کے ذریعے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ قانون کا تعلق صرف ظاہری عمل سے ہوتا ہے، اخلاق باطن اور نیت کو بھی دیکھتا ہے۔ قانون طاقت اور سزا کے خوف سے نافذ ہوتا ہے، اخلاق ضمیر اور خدا خوفی سے پروان چڑھتا ہے۔ قانون کم از کم رویے کا مطالبہ کرتا ہے، مثلاً یہ کہ دوسرے کا مال نہ چھینو، جبکہ اخلاق زیادہ سے زیادہ کا مطالبہ کرتا ہے، مثلاً یہ کہ ضرورت مند پر اپنا مال خرچ کرو۔ قانون کی خلاف ورزی پر عدالت پکڑتی ہے، اخلاق کی خلاف ورزی پر ضمیر ملامت کرتا ہے۔

اس فرق کے باوجود قانون اور اخلاق ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ معاون ہیں۔ اچھا قانون اخلاقی اقدار ہی کی حفاظت کے لیے بنایا جاتا ہے، اور اچھی اخلاقی تربیت قانون کی ضرورت کو کم کر دیتی ہے۔ جس معاشرے میں لوگ اخلاقاً دیانت دار ہوں وہاں نگرانی کے اخراجات کم ہو جاتے ہیں اور اعتماد بڑھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہذب قومیں قانون سازی کے ساتھ ساتھ کردار سازی پر بھی توجہ دیتی ہیں۔

نتیجہ

حاصل یہ ہے کہ اخلاق انسان کے نفس کی اس پختہ اور مستقل کیفیت کا نام ہے جس سے اچھے یا برے افعال آسانی اور روانی سے صادر ہوتے ہیں۔ اس کی حقیقت باطنی ہے اور اس کا اظہار ظاہری رویے میں ہوتا ہے، اس لیے یہ تکلف، بناوٹ اور وقتی جذبے سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی ماہیت وسیع اور ہمہ گیر ہے: یہ عقیدے اور عبادت سے جڑا ہوا، فطرت میں پیوست مگر محنت سے حاصل ہونے والا، قانون سے بلند تر اور انفرادی زندگی سے لے کر پورے سماجی نظام تک پھیلا ہوا ہے۔ اخلاق کو اسی جامع مفہوم میں سمجھنا اور اپنانا ہی ایک باوقار انسان اور پرامن معاشرے کی بنیاد ہے۔

سوال نمبر 3: اخلاقی معاشرے کے قیام میں انفرادی کردار کی مرکزی حیثیت (20 نمبر)

سوال نمبر 3۔ اخلاقی معاشرہ قائم کرنے کے لیے انفرادی کردار کس طرح مرکزی حیثیت رکھتا ہے؟ (20)

تعارف

ہر انسان ایک اچھے، پر امن اور انصاف پسند معاشرے کی خواہش رکھتا ہے، مگر اکثر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا معاشرہ بنے گا کیسے اور اس کی ابتداء کہاں سے ہو گی؟ بعض لوگ اس کا سارا بوجھ حکومت اور قانون پر ڈال دیتے ہیں، بعض تعلیمی اداروں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور بعض حالات کو کوستے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے، اور جیسے افراد ہوں گے ویسا ہی معاشرہ بنے گا۔ عمارت اینٹوں سے بنتی ہے، اگر اینٹیں ہی ٹیڑھی اور کچی ہوں تو نقشہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو، عمارت مضبوط نہیں ہو سکتی۔

اس لیے اخلاقی معاشرے کے قیام میں انفرادی کردار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ قانون باہر سے دباؤ ڈال سکتا ہے مگر اندر سے بدل نہیں سکتا، جبکہ کردار انسان کو اندر سے بدلتا ہے۔ جب ایک فرد سچا، امانت دار اور خدمت گزار بنتا ہے تو اس کا اثر اس کے گھر، محلے، دفتر اور بالآخر پورے معاشرے تک پھیلتا ہے۔ اس جواب میں ہم اس مرکزی حیثیت کی وجوہات کو مختلف پہلوؤں سے واضح کریں گے۔

معاشرہ افراد سے بنتا ہے

سب سے پہلی اور سادہ دلیل یہ ہے کہ معاشرہ کوئی جداگانہ وجود نہیں رکھتا، وہ افراد ہی کا دوسرا نام ہے۔ خاندان، محلہ، ادارہ، شہر اور ریاست سب افراد کے باہمی تعلقات کے نام ہیں۔ اگر ایک تاجر ملاوٹ کرتا ہے تو بازار بدنام ہوتا ہے، اگر ایک افسر رشوت لیتا ہے تو ادارہ فاسد کہلاتا ہے اور اگر ایک استاد بے ایمانی کرتا ہے تو تعلیم کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایک دیانت دار شخص اپنے پورے حلقے میں اعتماد کا ماحول پیدا کر دیتا ہے۔

اس حقیقت کو ایک اور مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ سمندر قطروں سے بنتا ہے مگر سمندر کی صفائی یا گندگی کا انحصار بھی قطروں پر ہی ہے۔ اسی طرح معاشرتی اقدار درحقیقت انفرادی اقدار کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ جب اکثریت ایفائے عہد کو اپنا شیوہ بنا لے تو معاشرہ بااعتماد کہلاتا ہے اور جب اکثریت خود غرض ہو جائے تو ہر ادارہ مفلوج ہو جاتا ہے۔ لہٰذا معاشرے کی اصلاح کا نقطۂ آغاز ہمیشہ فرد کی اصلاح ہے۔

کردار قانون سے زیادہ مؤثر ہے

اخلاقی معاشرے کے لیے قانون ضروری ہے مگر کافی نہیں۔ قانون کی نگرانی ہر جگہ اور ہر وقت ممکن نہیں ہوتی، کوئی پولیس ہر دکان، ہر دفتر اور ہر دل کے اندر نہیں جھانک سکتی۔ اس کے برعکس ایک باکردار انسان اپنے ضمیر کی نگرانی میں ہر وقت رہتا ہے۔ وہ تنہائی میں بھی امانت میں خیانت نہیں کرتا کیونکہ اس کا نگران اس کے اندر موجود ہے۔ یہی اندرونی نگرانی معاشرے کو وہ اخلاقی مضبوطی دیتی ہے جو بیرونی جبر سے حاصل نہیں ہوتی۔

مزید یہ کہ قانون صرف جرم کو روکتا ہے، نیکی پیدا نہیں کرتا۔ قانون یہ تو کہہ سکتا ہے کہ چوری نہ کرو، مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ بھوکے کو کھانا کھلاؤ، دکھی کا دل رکھو اور مخالف کو معاف کر دو۔ یہ بلند رویے صرف کردار سے پیدا ہوتے ہیں۔ جس معاشرے میں کردار زندہ ہو وہاں قانون کی ضرورت کم پڑتی ہے اور جس معاشرے میں کردار مر جائے وہاں قانون کتنا ہی سخت ہو، جرم نت نئی شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔

فرد تبدیلی کا نقطۂ آغاز ہے

تاریخ گواہ ہے کہ بڑی بڑی سماجی تبدیلیاں ہمیشہ افراد سے شروع ہوئی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام نے معاشروں کو بدلنے کا کام چند افراد کی کردار سازی سے شروع کیا اور وہی افراد بعد میں ایک نئے نظام کی بنیاد بنے۔ اصلاح کاروں، اساتذہ اور مصلحین کی زندگیاں بھی یہی سبق دیتی ہیں کہ ایک شخص جب خود کو بدل لیتا ہے تو اس کی ذات سے روشنی کی کرنیں پھوٹنے لگتی ہیں جو دوسروں کو بھی بدلنے کی ترغیب دیتی ہیں۔

اس کے برعکس اگر ہر شخص یہ کہہ کر بیٹھ جائے کہ میرے اکیلے کے بدلنے سے کیا ہو گا، تو تبدیلی کبھی آ ہی نہیں سکتی، کیونکہ معاشرہ انہی اکیلے اکیلے افراد سے بنا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہجوم درحقیقت ایک ایک قدم اٹھانے والوں کا نام ہے۔ قرآنِ مجید کا اصول بھی یہی ہے کہ اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کرے۔ یہ آیت انفرادی کردار کی مرکزی حیثیت کا سب سے مضبوط دلیلی ثبوت ہے۔

کردار کا اثر ور سوخ اور تقلید

انسانی فطرت ہے کہ وہ کہنے سے زیادہ دیکھ کر سیکھتا ہے۔ بچے والدین کی نقل کرتے ہیں، شاگرد استاد کی، ماتحت افسر کی اور عوام رہنماؤں کی۔ اس لیے ایک باکردار فرد خاموشی سے سینکڑوں لوگوں کا استاد بن جاتا ہے، جبکہ ایک بدکردار رہنما اپنی ایک حرکت سے پوری نسل کو بگاڑ سکتا ہے۔ اخلاقی معاشرے کی تعمیر میں لیکچر اور کتابیں اتنا اثر نہیں رکھتیں جتنا عملی نمونہ رکھتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اساتذہ، والدین، علماء، ڈاکٹر، تاجر اور سرکاری افسران جیسے بااثر افراد کا کردار غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ان کی دیانت دوسروں کے لیے حوصلہ اور ان کی بددیانتی دوسروں کے لیے بہانہ بن جاتی ہے۔ جب معاشرے کے نمایاں افراد خود اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں تو نیکی فیشن بن جاتی ہے اور برائی کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور یہی ماحول اخلاقی معاشرے کی اصل بنیاد ہے۔

خاندان: کردار سازی کی پہلی درس گاہ

انفرادی کردار کی مرکزی حیثیت کو سمجھنے کے لیے خاندان کے کردار کو دیکھنا ضروری ہے، کیونکہ معاشرے کی سب سے چھوٹی اکائی خاندان ہے اور وہیں سے فرد بنتا ہے۔ ماں باپ اگر سچے، نرم خو اور انصاف پسند ہوں تو بچے انہی اقدار کو سانس کی طرح جذب کر لیتے ہیں۔ اگر گھر میں جھوٹ، غیبت، خود غرضی اور بدزبانی کا ماحول ہو تو اسکول اور مدرسے کی تعلیم بھی اس کا مقابلہ مشکل سے کر پاتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اخلاقی معاشرہ بنانے کی ذمہ داری سب سے پہلے ہر اس شخص پر عائد ہوتی ہے جو کسی گھر کا سربراہ، والد یا والدہ ہے۔ وہ اگر اپنی ذات اور اپنے گھر کو سنوار لے تو درحقیقت وہ معاشرے کے ایک پورے خلیے کو سنوار رہا ہے۔ لاکھوں گھروں کی اصلاح ہی دراصل لاکھوں افراد کی اصلاح ہے اور یہی مجموعہ ایک دن اخلاقی معاشرے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

پیشہ ورانہ زندگی میں انفرادی کردار

اخلاقی معاشرہ صرف گھروں اور عبادت گاہوں سے نہیں بنتا، بازار، دفتر، اسپتال اور عدالت بھی اس کا حصہ ہیں۔ ڈاکٹر اگر مریض کو مریض سمجھ کر علاج کرے، گاہک نہ سمجھے، تو طبی پیشہ اعتماد پاتا ہے۔ تاجر اگر صحیح تولے اور عیب بتا کر بیچے تو تجارت عبادت بن جاتی ہے۔ جج اگر دباؤ کے باوجود انصاف کرے تو لوگوں کا نظام پر اعتماد بحال ہوتا ہے۔ یہ سب انفرادی فیصلے ہیں، مگر ان کا مجموعی اثر پورے معاشرے کی ساکھ بنتا ہے۔

اس کے مقابلے میں جب ہر پیشے کا فرد یہ سوچے کہ نظام ہی خراب ہے، میں اکیلا ٹھیک ہو کر کیا کروں گا، تو خرابی دائمی ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظام افراد ہی چلاتے ہیں، اور جب کافی تعداد میں افراد اپنے اپنے دائرے میں ٹھیک ہو جائیں تو نظام خود بخود ٹھیک ہونے لگتا ہے۔ اس لیے اصلاح کا عملی راستہ یہی ہے کہ ہر شخص اپنے پیشے اور اپنے منصب سے انصاف کرے۔

مشکلات اور ان کا حل

انفرادی کردار کو مرکزی ماننے کا مطلب یہ نہیں کہ راستہ آسان ہے۔ باکردار انسان کو اکثر نقصان، تنقید اور تنہائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ رشوت نہ لینے والا افسر ساتھیوں کی نظر میں ناقابلِ بھروسہ، سچ بولنے والا تاجر کاروباری حلقوں میں سادہ لوح اور سود سے بچنے والا شخص پرانے خیالات کا سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں کردار پر قائم رہنا صبر، استقامت اور مقصد کی پختگی مانگتا ہے۔

اس کا حل یہ ہے کہ نیک افراد تنہائی کے بجائے باہمی تعاون اور تنظیم کی طرف آئیں۔ جب دیانت دار لوگ ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تو نیکی کمزور نہیں رہتی بلکہ ایک طاقت بن جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تعلیمی اداروں، میڈیا اور مذہبی و سماجی تنظیموں کو بھی کردار سازی کو اپنی ترجیح بنانا چاہیے۔ یوں انفرادی کوشش اجتماعی قوت میں بدل جاتی ہے اور اخلاقی معاشرہ خواب سے حقیقت بننے لگتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اخلاقی معاشرے کے قیام میں انفرادی کردار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے کیونکہ معاشرہ افراد ہی سے بنتا ہے، قانون کے مقابلے میں کردار زیادہ گہرا اور دیرپا اثر رکھتا ہے، ہر بڑی تبدیلی فرد سے شروع ہوتی ہے اور ہر فرد اپنے حلقے میں دوسروں کے لیے نمونہ ہوتا ہے۔ خاندان سے لے کر پیشہ ورانہ زندگی تک ہر جگہ فرد کی دیانت اور خدمت ہی معاشرے کی صورت گری کرتی ہے۔ جو شخص اخلاقی معاشرہ چاہتا ہے اسے اس کا آغاز اپنی ذات سے کرنا ہوگا، کیونکہ بدلا ہوا فرد ہی بدلے ہوئے معاشرے کی پہلی اینٹ ہے۔

سوال نمبر 4: مریضوں سے شفقت اور نرمی کی اہمیت — اسلامی تعلیمات کی روشنی میں (20 نمبر)

سوال نمبر 4۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مریضوں سے شفقت اور نرمی کے رویے کی اہمیت پر روشنی ڈالیں۔ (20)

تعارف

بیماری انسان کی زندگی کے کمزور ترین لمحات میں سے ایک ہے۔ مریض جسمانی تکلیف کے ساتھ ساتھ ذہنی دباؤ، مستقبل کی فکر اور اپنے اہلِ خانہ کی پریشانی میں بھی مبتلا ہوتا ہے۔ ایسے میں اسے دواؤں کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز کی شدید ضرورت ہوتی ہے اور وہ ہے شفقت، نرمی اور ہمدردی۔ ایک نرم جملہ، ایک تسلی بھرا لہجہ اور ایک محبت بھرا رویہ کبھی کبھی وہ کام کر جاتا ہے جو مہنگی دوا بھی نہیں کر پاتی، کیونکہ انسان صرف جسم نہیں، روح اور جذبات کا مجموعہ بھی ہے۔

اسلام نے مریض کے ساتھ حسنِ سلوک کو صرف ایک سماجی خوبی نہیں بلکہ دینی فریضہ اور عبادت قرار دیا ہے۔ عیادت کو حقوقِ مسلمان میں شامل کیا گیا، مریض کی خدمت کو بڑے اجر کا ذریعہ بتایا گیا اور علاج کرنے والوں کو نرمی و رحم کی خاص تاکید کی گئی۔ اس جواب میں ہم اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مریضوں سے شفقت اور نرمی کی اہمیت کو قرآن و سنت، طبی اخلاقیات اور عملی زندگی کے حوالوں سے واضح کریں گے۔

قرآنِ مجید کی رہنمائی

قرآنِ مجید نے انسانی جان کی حرمت اور قدر و قیمت کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے اور ایک انسان کی زندگی بچانے کو پوری انسانیت کی زندگی بچانے کے برابر قرار دیا ہے۔ یہ اصول طبی خدمت کی بنیاد ہے، کیونکہ اس کے مطابق مریض کوئی معمولی چیز نہیں بلکہ ایک محترم انسانی جان ہے جس کی حفاظت عظیم نیکی ہے۔ قرآن نے کمزوروں، مسکینوں اور محتاجوں کے ساتھ رحم اور نرمی کا حکم بار بار دیا ہے اور مریض انہی کمزور طبقات میں سب سے زیادہ مستحق ہے۔

قرآنِ مجید نے والدین کے ساتھ نرم گفتگو اور اکرام کا جو حکم دیا ہے وہ درحقیقت ہر کمزور اور محتاج انسان کے ساتھ رویے کا عمومی اصول سکھاتا ہے کہ طاقتور کو کمزور کے سامنے جھکنا اور اس سے نرمی سے پیش آنا چاہیے۔ اسی طرح قرآن نے نبی کریم ﷺ کی نرمی کو رحمتِ الٰہی کا نتیجہ قرار دے کر یہ اصول قائم کر دیا کہ دلوں کو جیتنے اور دکھ دور کرنے کا راستہ سختی نہیں بلکہ نرمی ہے۔ یہ اصول اسپتال کے ماحول پر بھی اسی طرح لاگو ہوتا ہے جس طرح دعوت و تبلیغ پر۔

سنتِ نبوی ﷺ اور عیادت کی فضیلت

رسول اللہ ﷺ کی سیرت مریضوں سے شفقت کی سب سے روشن مثال ہے۔ آپ ﷺ خود بیماروں کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے، ان کے پاس بیٹھتے، ان کے لیے دعا فرماتے اور تسلی کے کلمات ارشاد فرماتے۔ آپ ﷺ نے عیادت کو مسلمان کے مسلمان پر حقوق میں شامل فرمایا اور خبر دی کہ عیادت کرنے والا واپسی تک رحمت میں ڈوبا رہتا ہے اور اس کے لیے جنت میں باغ تیار کیا جاتا ہے۔ ایک حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں بیمار تھا تو تُو نے میری عیادت نہ کی، یعنی مریض کی خدمت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر کے اس کی عظمت کو انتہا تک پہنچا دیا۔

آپ ﷺ نے مریض کو مایوسی کے بجائے امید دلانے کی تعلیم دی۔ جب کوئی بیمار آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا یا آپ اس کی عیادت کو جاتے تو فرماتے کہ گھبراؤ نہیں، ان شاء اللہ یہ بیماری گناہوں سے پاکی کا ذریعہ بنے گی۔ یہ کلمات مریض کے ٹوٹے ہوئے حوصلے کو جوڑ دیتے تھے۔ اس سے یہ عظیم طبی اصول بھی ملتا ہے کہ علاج کرنے والے کی گفتگو خود علاج کا حصہ ہے، اور مایوسی پھیلانا یا مریض کو بوجھ سمجھ کر جھڑکنا اسلامی اخلاق کے سراسر خلاف ہے۔

نرمی کا علاج پر طبی اور نفسیاتی اثر

جدید طبی تحقیق بھی اس اسلامی اصول کی تصدیق کرتی ہے کہ مریض کی ذہنی کیفیت اس کی صحت یابی پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ جب مریض کو توجہ، احترام اور تسلی ملتی ہے تو اس کا دباؤ کم ہوتا ہے، نیند بہتر ہوتی ہے، وہ دوا باقاعدگی سے کھاتا ہے اور ڈاکٹر کی ہدایات پر پورا عمل کرتا ہے۔ اس کے برعکس بداخلاقی، بے توجہی اور سخت رویہ مریض میں خوف، غصہ اور بے اعتمادی پیدا کرتا ہے جس سے بیماری لمبی اور علاج مشکل ہو جاتا ہے۔

بہت سے مریض اپنی اصل تکلیف بتانے سے اس لیے ہچکچاتے ہیں کہ انہیں ڈانٹ کا خطرہ ہوتا ہے۔ نرم رویہ مریض کو کھل کر بات کرنے کا حوصلہ دیتا ہے جس سے تشخیص درست ہوتی ہے۔ بچوں، بزرگوں اور ذہنی مریضوں کے معاملے میں تو نرمی علاج کی شرطِ اول ہے، کیونکہ یہ طبقات اپنی بات پوری طرح بیان بھی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا شفقت صرف اخلاقی خوبی نہیں بلکہ کامیاب علاج کی پیشہ ورانہ ضرورت بھی ہے۔

ڈاکٹر اور طبی عملے کے لیے اخلاقی تقاضے

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ڈاکٹر اور طبی عملے پر کئی اخلاقی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ مریض کو عزت دی جائے، اس کے نام سے مخاطب کیا جائے اور اسے کمتر نہ سمجھا جائے۔ دوسری یہ کہ اس کی بات صبر سے سنی جائے، سوال کا جواب سادگی سے دیا جائے اور طبی اصطلاحات کے الجھاؤ میں اسے خوفزدہ نہ کیا جائے۔ تیسری یہ کہ مریض کے راز کی حفاظت کی جائے، کیونکہ بیماری کی معلومات امانت ہیں۔ چوتھی یہ کہ امیر و غریب، جاننے والے اور اجنبی سب کے ساتھ یکساں نرمی برتی جائے۔

نرسنگ اور پیرامیڈیکل عملے کا کردار اس سلسلے میں اور بھی اہم ہے کیونکہ مریض کا سب سے زیادہ وقت انہی کے ساتھ گزرتا ہے۔ رات کی تکلیف میں ایک نرم ہاتھ اور ایک تسلی بخش جملہ مریض کے لیے نیند سے بڑھ کر قیمتی ہوتا ہے۔ اسی لیے طبی تعلیم میں اب دنیا بھر میں اخلاقیات اور مواصلات کی مہارت کو نصاب کا حصہ بنایا جا رہا ہے، جو دراصل اسی اسلامی اصول کی بازگشت ہے کہ خدمتِ مریض ایک فنی کام کے ساتھ ساتھ انسانی اور اخلاقی فریضہ بھی ہے۔

عیادت کرنے والوں اور اہلِ خانہ کے آداب

شفقت و نرمی کا تقاضا صرف طبی عملے سے نہیں بلکہ عیادت کرنے والوں اور اہلِ خانہ سے بھی ہے۔ سیرت سے یہ آداب ملتے ہیں کہ عیادت مختصر ہو تاکہ مریض اور اس کے گھر والوں پر بوجھ نہ بنے، مریض کے سامنے ایسی باتیں نہ کی جائیں جو اسے پریشان کریں، شور اور بھیڑ سے پرہیز کیا جائے اور مریض کے لیے خلوص سے دعا کی جائے۔ مریض کے سامنے اس کی بیماری کی خوفناک تفصیلات اور دوسروں کی اموات کے قصے سنانا شفقت کے سراسر منافی ہے۔

اہلِ خانہ کا کردار سب سے طویل اور سب سے اہم ہوتا ہے۔ لمبی بیماری میں تیمار دار تھک جاتا ہے، مگر اسلامی تعلیم صبر کی تلقین کے ساتھ تیمار داری کو بھی اجر و ثواب کا کام قرار دیتی ہے۔ مریض کی چڑچڑاہٹ کو اس کی تکلیف کا نتیجہ سمجھ کر درگزر کرنا، اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھنا اور اسے گھر میں بوجھ محسوس نہ ہونے دینا وہ عملی شفقت ہے جس کی مریض کو سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

سماجی اور معاشرتی فوائد

مریضوں سے شفقت کا رویہ صرف فرد کی نیکی نہیں، اس کے وسیع سماجی فوائد بھی ہیں۔ جب معاشرہ بیماروں کا خیال رکھتا ہے تو ہر شخص کو یہ اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ مشکل وقت میں وہ اکیلا نہیں چھوڑا جائے گا۔ یہی اطمینان معاشرتی اعتماد اور باہمی محبت کی بنیاد ہے۔ اسپتالوں میں حسنِ اخلاق کا ماحول شکایات اور تنازعات کم کرتا ہے، مریض اور طبی عملے کے درمیان اعتماد بڑھاتا ہے اور اس اعتماد سے پورا نظامِ صحت بہتر ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس جہاں مریضوں سے بے رخی عام ہو وہاں لوگ علاج سے گھبرانے لگتے ہیں، بیماری چھپاتے ہیں اور غیر مستند طریقوں کی طرف جاتے ہیں جس سے صحت کے مسائل بڑھ جاتے ہیں۔ مخیر حضرات کی طرف سے علاج میں تعاون، مریضوں کے لیے امدادی فنڈز اور اسپتالوں میں رضاکار خدمات بھی اسی شفقت کے سماجی اظہار ہیں جن کی اسلام حوصلہ افزائی کرتا ہے، کیونکہ بیمار کی حاجت پوری کرنا صدقے کے بڑے کاموں میں شمار ہوتا ہے۔

نتیجہ

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مریضوں سے شفقت اور نرمی محض ایک اچھی عادت نہیں بلکہ دینی فریضہ، انسانیت کا تقاضا اور کامیاب علاج کی بنیاد ہے۔ قرآن نے انسانی جان کی حرمت سکھائی، سنت نے عیادت اور تسلی کا عملی نمونہ دیا، اور جدید طب نے بھی ثابت کر دیا کہ نرم رویہ صحت یابی کو تیز کرتا ہے۔ ڈاکٹر، نرس، اہلِ خانہ اور عیادت کرنے والوں سمیت ہر شخص کو چاہیے کہ مریض کے ساتھ ہمیشہ وہ رویہ اختیار کرے جو کل اپنی بیماری کے وقت وہ اپنے لیے پسند کرے گا۔ یہی سنہری اصول اسلامی اخلاقیات کا خلاصہ ہے۔

سوال نمبر 5: اخلاقیات — انفرادی صفات نہیں، اجتماعی فلاح کا ذریعہ (20 نمبر)

سوال نمبر 5۔ "اخلاقیات محض انفرادی صفات نہیں بلکہ اجتماعی فلاح کا ذریعہ ہیں" اس جملے کی وضاحت مثالوں کے ساتھ کریں۔ (20)

تعارف

عام طور پر اخلاق کو ایک ذاتی اور نجی معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ کوئی شخص سچا ہے یا جھوٹا، نرم خو ہے یا سخت، یہ اس کا اپنا معاملہ ہے اور اس سے معاشرے کو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ مذکورہ جملہ اسی محدود تصور کی تردید کرتا ہے اور یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ اخلاقیات انفرادی صفات ہونے کے ساتھ ساتھ اجتماعی فلاح کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ کوئی بھی صفت جب ایک فرد سے نکل کر خاندان، ادارے اور معاشرے تک پھیلتی ہے تو وہ نظام کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔

اس جملے کو سمجھنے کی کنجی یہ ہے کہ انسان کی کوئی صفت بھی ہوا میں معلق نہیں رہتی، ہر صفت اپنے اثرات رکھتی ہے۔ سچ بولنے والے کی سچائی سے بازار کا اعتماد بنتا ہے، امانت دار کی امانت سے ادارے چلتے ہیں اور رحم دل انسان کی رحمت سے کمزور طبقات کو سہارا ملتا ہے۔ اس جواب میں ہم اس جملے کی وضاحت مختلف اخلاقی صفات کی مثالوں کے ساتھ کریں گے اور دکھائیں گے کہ فلاحِ اجتماعی کی عمارت انہی انفرادی صفات پر کھڑی ہوتی ہے۔

جملے کا مفہوم

اس جملے کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ یہ کہ اخلاقیات انفرادی صفات ضرور ہیں، یعنی سچائی، عدل، صبر، سخاوت اور عفت جیسی خوبیاں فرد کی ذات میں پیدا ہوتی ہیں اور اسی کے ارادے سے عمل میں آتی ہیں۔ دوسرا حصہ یہ کہ یہ صفات وہیں ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ اجتماعی فلاح کا ذریعہ بنتی ہیں، یعنی ان کے نتیجے میں پورا معاشرہ امن، اعتماد، تعاون اور خوشحالی سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ گویا فرد بیج ہے اور معاشرہ اس کا پھل، اور فلاح اس درخت کا سایہ ہے جس سے سب فیض پاتے ہیں۔

اجتماعی فلاح سے مراد صرف مادی خوشحالی نہیں بلکہ امن و امان، انصاف، تعلیم و صحت تک رسائی، کمزوروں کا تحفظ اور باہمی اعتماد جیسی تمام بھلائیاں ہیں۔ دنیا کی کوئی حکومت صرف قانون اور بجٹ سے یہ چیزیں فراہم نہیں کر سکتی جب تک شہریوں میں اخلاقی صفات موجود نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مذاہب اور مصلحین نے معاشرتی اصلاح کی بنیاد کردار سازی کو قرار دیا ہے۔

مثال 1: سچائی اور اجتماعی اعتماد

سچائی بظاہر ایک فرد کی صفت ہے، مگر اس کے اثرات پورے معاشرے پر پڑتے ہیں۔ جس بازار کے تاجر سچ بولتے ہیں وہاں خرید و فروخت اعتماد سے ہوتی ہے، نہ لمبے جھگڑے ہوتے ہیں اور نہ جانچ پڑتال پر وقت اور پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ جس عدالت میں گواہ سچ بولتے ہیں وہاں بے گناہ بچ جاتا ہے اور نظامِ انصاف زندہ رہتا ہے۔ جس میڈیا اور دفاتر میں سچ بولا جاتا ہے وہاں فیصلے درست معلومات پر ہوتے ہیں اور قوم غلطیوں سے بچتی ہے۔

اس کے برعکس جھوٹ کی وبا پھیل جائے تو پورا سماجی نظام مفلوج ہو جاتا ہے۔ دستاویزات پر بھروسہ ختم ہو جاتا ہے، معاہدے ٹوٹنے لگتے ہیں، رشتے شک کی نذر ہو جاتے ہیں اور ہر شخص دوسرے سے دھوکے کا اندیشہ رکھتا ہے۔ یہ مثال واضح کرتی ہے کہ ایک فرد کا سچ یا جھوٹ اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ یا تو اجتماعی اعتماد کی دولت بڑھاتا ہے یا اسے لوٹ لیتا ہے۔

مثال 2: امانت و دیانت اور معاشی فلاح

امانت داری ایک انفرادی صفت ہے، مگر معیشت کی پوری عمارت اسی پر کھڑی ہے۔ بینک، کمپنیاں، شراکت داریاں اور سرکاری خزانے سب اسی بھروسے پر چلتے ہیں کہ لوگ امانت میں خیانت نہیں کریں گے۔ دیانت دار افسر عوامی رقم کو عوام پر خرچ کرتا ہے جس سے سڑکیں، اسکول اور اسپتال بنتے ہیں۔ دیانت دار ملازم ادارے کو ترقی دیتا ہے اور ایماندار تاجر ملاوٹ اور ذخیرہ اندوزی سے باز رہ کر عوام کو مہنگائی کے ظلم سے بچاتا ہے۔

جب امانت ختم ہوتی ہے تو کرپشن جنم لیتی ہے جس کا نقصان کسی ایک فرد کو نہیں بلکہ پورے ملک کو ہوتا ہے۔ منصوبے ادھورے رہتے ہیں، میرٹ پامال ہوتا ہے، سرمایہ کار بھاگ جاتے ہیں اور غریب مزید غریب ہو جاتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ قوموں کی معاشی تباہی کی سب سے بڑی وجہ وسائل کی کمی نہیں بلکہ دیانت کی کمی رہی ہے۔ پس امانت ایک فرد کی خوبی ہوتے ہوئے بھی قومی فلاح کی ضمانت ہے۔

مثال 3: عدل اور امنِ اجتماعی

عدل و انصاف کی صفت بھی اسی حقیقت کی روشن مثال ہے۔ ایک جج کا عدل پورے ضلع میں امن قائم کر دیتا ہے، ایک افسر کا انصاف ماتحتوں میں اطمینان پیدا کرتا ہے اور والدین کا اولاد کے درمیان انصاف خاندان کو دشمنی سے بچا لیتا ہے۔ جہاں انصاف ملتا ہے وہاں لوگ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے تشدد اور قانون شکنی کی طرف نہیں جاتے، کیونکہ انہیں پرامن راستے پر اعتماد ہوتا ہے۔ یوں عدل جرائم اور فساد کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔

ظلم کا نتیجہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ ناانصافی سے محرومی کا احساس پیدا ہوتا ہے، محرومی سے نفرت جنم لیتی ہے اور نفرت بالآخر بغاوت، جھگڑوں اور انتشار کی شکل اختیار کرتی ہے۔ بڑے بڑے سماجی انقلابوں کے پیچھے یہی اخلاقی صفت کی کمی کارفرما رہی ہے۔ اسی لیے قرآنِ مجید نے عدل کو تقویٰ کے قریب ترین قرار دیا اور عدل کو اللہ کی محبوب صفات میں سے بتایا۔

مثال 4: سخاوت، ہمدردی اور کمزوروں کی فلاح

سخاوت اور ہمدردی انفرادی اوصاف ہیں، مگر یہی اوصاف معاشرے میں فلاحی نظام کی بنیاد بنتے ہیں۔ زکاۃ، صدقات، وقف اور خیرات انہی جذبات کی عملی شکلیں ہیں جن سے یتیموں کی تعلیم، بیواؤں کا گزارا، مریضوں کا علاج اور ضرورت مندوں کی شادی و روزگار کا بندوبست ہوتا ہے۔ اسلامی تاریخ کے عظیم الشان اسپتال، مدارس اور لنگر خانے کسی سرکاری بجٹ سے نہیں بلکہ افراد کی سخاوت اور وقف کی اخلاقی روایت سے قائم ہوئے تھے۔

آج بھی دنیا بھر کی فلاحی تنظیمیں، بلڈ بینک، امدادی فنڈز اور رضاکار خدمات اسی جذبے پر قائم ہیں۔ جب ایک فرد مدد کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے تو ایک گھر کا چولہا جلتا ہے، مگر جب یہ جذبہ لاکھوں افراد میں پھیل جاتا ہے تو پورے معاشرے میں کوئی بھوکا نہیں سوتا۔ اس کے برعکس خود غرضی اور کنجوسی دولت کو چند ہاتھوں میں سمٹ کر طبقاتی کشمکش پیدا کرتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سخاوت ذاتی نیکی بھی ہے اور اجتماعی فلاح کا انجن بھی۔

مثال 5: صبر، برداشت اور پرامن بقائے باہمی

صبر، تحمل اور برداشت ایک شخص کی انفرادی خوبیاں معلوم ہوتی ہیں، مگر مختلف عقائد، زبانوں اور طبقوں والے معاشرے میں امن کا قیام انہی خوبیوں پر منحصر ہے۔ سڑک پر حادثے کے بعد صبر کرنے والا ڈرائیور جھگڑے اور قتل تک نوبت نہیں آنے دیتا۔ پڑوسی کی غلطی برداشت کرنے والا خاندان محلے کا ماحول بچا لیتا ہے۔ انتظامیہ اور عوام دونوں میں برداشت جمہوری اور سماجی زندگی کو پرامن رکھتی ہے۔

جہاں یہ صفات کمزور پڑ جائیں وہاں معمولی بات پر فساد، فرقہ وارانہ کشیدگی اور تشدد پھوٹ پڑتا ہے جس میں جان و مال کا ضیاع پورے علاقے کو متاثر کرتا ہے۔ اسی طرح گھریلو زندگی میں صبر و برداشت طلاق و علیحدگی کی نوبت کم کرتی ہے اور بچوں کو ٹوٹے گھروں کے نفسیاتی نقصانات سے بچاتی ہے۔ گویا ایک فرد کی برداشت ہزاروں افراد کے سکون کی حفاظت کرتی ہے۔

مثال 6: عفت، حیا اور خاندانی نظام کا تحفظ

عفت و پاکدامنی اور حیا بھی انفرادی صفت ہی سمجھی جاتی ہے، مگر اس کا سب سے بڑا ثمرہ اجتماعی ہے۔ اس صفت سے خاندانی نظام محفوظ رہتا ہے، بچوں کو ماں باپ کی مکمل توجہ اور تحفظ ملتا ہے، اور معاشرے میں بے راہ روی سے پیدا ہونے والے مسائل — جیسے خاندانوں کا بکھراؤ، بچوں کی بے سہارگی اور اخلاقی بے راہ روی کی وبائیں — کم ہو جاتی ہیں۔ مغربی معاشروں کے سماجی اعداد و شمار بھی دکھاتے ہیں کہ خاندانی استحکام کا گہرا تعلق انہی اخلاقی اقدار سے ہے۔

اسی طرح وقت کی پابندی، صفائی اور ذمہ داری جیسی چھوٹی سمجھی جانے والی صفات بھی اجتماعی سطح پر بڑے نتائج دیتی ہیں۔ وقت کے پابند شہریوں کا ملک کارکردگی میں آگے ہوتا ہے، صفائی پسند بستیوں میں بیماریاں کم ہوتی ہیں اور ذمہ دار شہری ٹیکس، قانون اور ماحول سب کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی صفات مل کر قوم کی اجتماعی تصویر بناتی ہیں۔

نتیجہ

حاصل یہ ہے کہ یہ جملہ مکمل طور پر درست ہے کہ اخلاقیات محض انفرادی صفات نہیں بلکہ اجتماعی فلاح کا ذریعہ ہیں۔ سچائی اعتماد پیدا کرتی ہے، امانت معیشت کو چلاتی ہے، عدل امن قائم کرتا ہے، سخاوت کمزوروں کا سہارا بنتی ہے، برداشت بقائے باہمی کی ضمانت دیتی ہے اور عفت خاندان و سماج کی حفاظت کرتی ہے۔ فرد اور معاشرہ لازم و ملزوم ہیں، لہٰذا جو قوم فلاح چاہتی ہے اسے افراد کی کردار سازی پر توجہ دینی ہوگی، کیونکہ اخلاقی افراد کے بغیر فلاحی معاشرہ ایک ایسا خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں۔